میں کچھ فسادیوں نے آگ لگا دی۔ پرنسپل نے فوراً لڑکیوں کو امتحان گاہ سے نکالا اور ایف سی کالج لے گئیں۔ وہاں ہی انہوں نے حساب کا پرچہ دیا۔''

''پھر جی یہ تو حالات سب کے ہیں۔ پھر؟''

''میرا کہنے کا مطلب ہے کہ میری بیٹی مخلوط تعلیم کو صرف اتنا جانتی ہے اس سے زیادہ اس کا Exposure نہیں ہے۔''

پتہ نہیں امی کو میری نیت پر شبہ تھا یا وہ مخلوط تعلیم کے حوالے سے لڑکیوں کو غیر محفوظ سمجھتی تھیں۔ وہ کچھ چپ سی ہو گئیں اور حامی نہ بھری۔ امی کا تذبذب بھانپ کر زبیدہ آپا بولیں ''نچنتے میں وہاں ہوں۔ مرغی کے پروں تلے قدسیہ رہے گی۔ آپ خدا کے لیے فکر نہ کریں.....''

ریزی نے مزاحمت کی کیونکہ وہ خود ان دنوں گورنمنٹ کالج میں ایف ایس سی کر رہا تھا' لیکن امی نے اُس کی پروا نہ کی۔ دوسری مزاحمت بابو محمد یعقوب کی طرف سے آئی۔ بابو محمد یعقوب ان دنوں لیڈی میکلیگن کالج میں ہیڈ کلرک تھے۔ پی اے کا لفظ تو ابھی ایجاد نہ ہوا تھا' لیکن یوں سمجھیے کہ وہی صاحب کی تاریں کھینچنے والے اور اُسے پتلی کی طرح نچانے والی طاقت تھے۔

ایک اچھے Executive کے لیے ایک قابل پی اے نہایت اہم ہوتا ہے۔ اگر وہ آئین اور اصولوں کو زبانی Quote کر سکتا ہے۔ افسر کو نکلنے کے راستے بتا سکتا ہے۔ حدود میں رکھنے اور حدود کو سلیقے سے توڑنے کی ترکیبیں سمجھا سکتا ہے تو ایسا افسر بڑی جلدی نیک نامی کو پہنچ جاتا ہے۔

بابو محمد یعقوب جالندھر میں ہماری زمینوں کی دیکھ ریکھ کرتے تھے۔ جب 1936ء میں میری والدہ جالندھر سے تبدیل ہو کر دھرمسالہ گئیں تو اُن کے پاس جالندھر شہر میں کچھ زمین تھی' جس پر سٹرابیری' رس بھری اور دیگر پھلوں اور سبزیوں کی کاشت ہوتی تھی۔ بابو محمد یعقوب جالندھر کے سکول میں بھی امی کے ہیڈ کلرک تھے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی زمینیں اور ہماری زمینوں کی دیکھ ریکھ بھی کرتے تھے۔

اب لیڈی میکلیگن میں بابو جی محمد از سرِ نو امی کے ہیڈ کلرک بن گئے۔ یہی بابو جی بہت بعد میں چشتیہ مسلک کے پیر بن گئے۔ ان کے دربار پر قوالی ہوتی تھی۔ لوگ نذرانے پیش کرتے تھے اور وہ اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے..... ''بھائی رجوع کرو۔ رجوع کرو۔ سب جواب مل جائیں گے۔ سب شکوک رفع ہو جائیں گے۔ تم صرف رجوع کرو۔''

سنت نگر میں جہاں ان کا ڈیرہ بن گیا' بڑی محفلیں ہوئیں لیکن امی' ریزی اور میں نے کبھی رجوع نہیں کیا..... ہمارے لیے وہ ہمیشہ بابو جی رہے..... امی جی کے شفیق ہیڈ کلرک۔ جب انہیں پتہ چلا کہ میں ایم اے اردو کرنے گورنمنٹ کالج جانا چاہتی ہوں تو انہوں نے چند رجسٹر اُٹھائے' امی کے دفتر کی چق اٹھائی اور مے آئی کم ان پلیز کہے بغیر اندر داخل ہوئے۔

''جی ایک عرض کرنا تھی..... اگر آپ کے پاس وقت ہو۔''

''جی بابو جی۔''

''ویسے تو جی مجھے دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں' لیکن میں چھوٹی بی بی کو تب سے جانتا ہوں جب میں

تھر سائے آیا کرتا تھا۔ وہ بہت بھولی روح ہے۔"

"ایسی روحوں کی نگرانی کرنا پڑتی ہے۔"

"بابو جی! میں نے ایسی تربیت کی ہے کہ وہ بھٹک نہیں سکتی۔"

اب سامنے ایک افسر بول رہا تھا۔ بابو جی کچھ گھبرا گئے "دیکھ لیجئے آپ بہتر سمجھتی ہیں۔ لیکن مخلوط تعلیم میں بیٹی کو بھیجنا میرا خیال ہے کہ..... عقلمندی نہیں ہے۔"

امی نے پتہ نہیں اندر کیا محسوس کیا لیکن معاملے کو Dismiss کر دیا اور تنخواہوں کے کاغذ سائن کرنے میں مشغول ہو گئیں۔

گورنمنٹ کالج میں داخلے کے لیے امی کو ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ نے بھی منایا۔ وہ گورنمنٹ کالج میں پڑھاتے تھے۔ عربی کے سکالر تھے اور اردو ایم اے کے پہلے Batch میں عربی کی کلاس ان ہی کی ذمہ داری تھی۔ ایک روز وہ بی ٹی کی کلاس کو لیکچر دینے آئے تو بڑے ہال میں لیکچر کے بعد باتوں باتوں میں امی نے اُن سے ایم اے اردو کا ذکر کیا۔

"آپا جی آپ کیا سوچ رہی ہیں۔ فوراً قدسیہ کو داخل کرائیں۔ وقت بدل گیا ہے۔ اب لڑکیوں کا وقت بھی قیمتی ہے۔ پاکستان کو تعلیم یافتہ خواتین کی ضرورت ہے۔"

"لیکن میں اس کی شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

"ذرا سوچیں اگر آپ تعلیم یافتہ نہ ہوتیں..... تو آج آپ بیوگی کے بعد بچوں کو لے کر کس کے پاس جاتیں؟ تعلیم تو جنتی ہو اہم ہے۔ اس کی خاطر تو چین بھی جانا پڑے تو حکم سمجھ کے جانا چاہیے۔"

فیصلہ بڑی آسانی سے ہو گیا۔ ہمارے گھر میں فیصلے عورتوں کے ہاتھ میں تھے۔ اس بار بھی منجدھار میں ریزی اور بوبی کی آواز ڈوب گئی۔ امی جی نے پرنسپل کرامت صاحب کو فون کیا اور میں کالج پہنچ گئی۔

کچھ باتیں گویا مقدر کا حصہ ہوتی ہیں۔ مجھے گورنمنٹ کالج میں اشفاق احمد سے ملنا تھا۔ میرے مستقبل کا تعین وقت امکانات سب اس بات میں پوشیدہ تھے کہ میں گورنمنٹ کالج پہنچوں۔ اس مقام پر پہنچنے کے لیے مجھے بی اے کرایا گیا۔ حالانکہ 1947ء میں جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا' حالات دگرگوں تھے۔ جس روز میرا ریاضیات کا پرچہ تھا کنیرڈ کالج کے اس بلاک میں جو لب سڑک تھا' آگ لگ گئی۔ اصولاً تو کالج بند ہو جانا چاہیے تھا' لیکن مجھے ایم اے کرنا تھا۔ مجھے خاں صاحب سے ایک مقررہ مقام پر ملنا تھا' اس لیے بی اے کا پرچہ دینا پڑا۔

اُس وقت کالج کی پرنسپل مس مکنیر (Macnaire) تھیں۔ قریباً چھ فٹ اونچی لمبی' سخت قسم کی منتظم خاتون نے بی اے کی لڑکیوں کو کمرہ امتحان سے نکالا۔ کالج بس میں سوار کیا۔ خود ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی اور سیدھی ایف سی کالج پہنچیں۔ یہاں لڑکے بی اے کے پرچے دے رہے تھے۔ انہوں نے ممتحن سے ساز باز کی۔ ہمیں بٹھایا اور خود بکریوں کی رکھوالا بن کر کمرہ امتحان میں بیٹھ گئیں..... مخلوط تعلیم کا یہ پہلا منظر میری نگاہ نے دیکھا۔

ادھر اشفاق صاحب کو گویا حکم ملا کہ وہ ایم اے اردو کر لیں۔ وہ اس وقت تک منشی فاضل کر چکے تھے۔ مکتبہ جدید سے اُن کی کتاب "ایک محبت سو افسانے" چھپ رہی تھی اور انہیں ہرگز ایم اے اردو کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ

حب الوطنی کے سلسلے میں بڑی پُر جوش تقاریر کر چکے تھے اور جانتے تھے کہ تبدیلی زندگی کا اہم حصہ ضرور ہے لیکن ساتھ ہی جانتے تھے ۔

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایمان ہے
مرے بُت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

فیصلہ میری تقدیر نے کیا یا میری والدہ نے۔ بہرکیف میں کالج پہنچی۔ پرنسپل آفس میں پروفیسر کرامت موجود تھے۔ اُن کی شخصیت میں بڑا میٹھا سا رُعب تھا۔ جیسے وہ پہلے آپ کی مان کر پھر اپنی منوانے کے عادی تھے۔ قیام پاکستان کے بعد تعلیم ایک بڑے انقلابی دور سے گزر رہی تھی۔ مسائل ان گنت تھے۔ وسائل کی کمی تھی۔ بھانت بھانت کے لوگ اپنے ذاتی مسائل میں الجھ کر اپنے آپ کو مظلوم سمجھنے میں مصروف تھے۔ ہر ایک کی انا اپنی شناخت کے چکر میں تھی۔

پروفیسر کرامت صاحب نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔

میں ہر خوف زدہ انسان کی طرح کرسی پر آگے ہو کر بیٹھی۔

''آپ نے بی اے کہاں سے کیا؟''

''کنیئرڈ کالج سے جی۔''

''اور فسٹ ڈویژن آئی؟'' سوال ہوا۔

''جی فسٹ ڈویژن ضرور آتی..... لیکن جس روز میرا ریاضیات کا پرچہ تھا اُس دن جیل روڈ پر آگ لگ گئی۔ ہمیں بس میں بٹھا کر ایف سی کالج لے گئے۔ بڑی افراتفری میں ہنگامی سنٹر بنا..... ہم لڑکیاں اتنی نروس تھیں کہ پرچے زیادہ اچھے نہیں ہوئے ورنہ تو جی.....'' میں نے بار بار بتائی ہوئی حقیقت بیان کی۔

''اور بی اے میں کون کون سے سبجیکٹ لیے۔''

میں لجاجت سے بولی ''اے کورس Maths اور اکنامکس۔''

''اور میتھس کون پڑھاتا تھا؟''

''پروفیسر سردار لعل۔''

''اچھا اچھا..... وہ تو ہمارے ہی پروفیسر ہیں اور اکنامکس۔''

''مس متھائی۔''

''جی۔''

''ساؤتھ سے آئی ہیں۔ اُن کے بھائی نے اکنامکس پر بڑی معرکے کی کتاب لکھی ہے۔ وہی مس متھائی۔''

''جی۔''

''پھر بھائی اتنے قابل پروفیسروں سے پڑھ کر تم ایم اے اردو کر کے کیا کرو گی..... یا Math میں ایم اے کرو یا Economics میں۔''

''جی مجھے اردو کا شوق ہے۔ میں رائٹر بننا چاہتی ہوں۔''

وہ ہلکا سا مسکرائے اور پھر کچھ وقفے کے بعد بولے ''کیا تمہیں معلوم ہے کہ پطرس بخاری صاحب نے اس سبجیکٹ میں ڈرامے کا اجراء کیا ہے' لیکن اب وہ یونیسکو چلے گئے ہیں۔ ہم کچھ تجرباتی سا کام کر رہے ہیں۔ ابھی پروفیسروں کا بھی انتخاب مکمل نہیں ہوا۔ بہرکیف تم برسر صاحب سے مل لو۔ فیس وغیرہ داخل کروادو..... فارم احتیاط سے بھرنا..... تھینک یو۔''

پرنسپل صاحب کھڑے ہوگئے یعنی مجھے برخاست کر دیا۔ میں نے دبی زبان میں شکریہ ادا کیا اور اُن کے کلرک کے پاس پہنچی۔ کھڑکی کے ساتھ لگ کر ایک نوجوان کھڑا تھا۔

گورا چٹا خوبصورت لڑکا جس نے کھڑکی کے ساتھ کہنی ٹیک رکھی تھی۔ جس وقت میں وہاں پہنچی وہ فوراً مؤدب ہو کر ایک طرف ہوگیا۔ نظریں نیچی رکھیں اور مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہ کی۔ جب میں فیس دے چکی تو برسر صاحب نے تعارف کے انداز میں کہا ''بی بی یہ اشفاق احمد ہیں۔ یہ آپ کے ساتھ ایم اے اردو کریں گے۔ ان کی فیس میں نے ابھی جمع کی ہے.....''

یہ میرا خاں صاحب سے پہلا تعارف تھا.....

لیڈی میکلیگن سے گورنمنٹ کالج تک دو چوراہوں کا راستہ تھا۔ پہلے سیکرٹریٹ کو جانے والا چوک آتا۔ اس کے بعد وہ چوک جس پر بھنگیوں کی توپ نصب تھی۔ اگر مال روڈ کی طرف رُخ کر کے دیکھیں تو دائیں ہاتھ وہ عمارت آتی جو بعد میں NCA کی درس گاہ بنی اور یہیں لاہور کا مشہور میوزیم تھا۔

بھنگیوں کی توپ کے دائیں ہاتھ ایک اور چوک آتا جو انارکلی بازار کا سنگھم تھا۔ گورنمنٹ کالج کے عین سامنے چھوٹا سا باغ تھا اور یہی سڑک بائیں ہاتھ لڑکوں کے ہوسٹل کی طرف بھی جاتی تھی۔

گورنمنٹ کالج کا پھاٹک کھلتے ہی دو پکی سڑک آتی جس کے بائیں ہاتھ نشیب میں اوول کی گراؤنڈ تھی' جس میں ہر سال سپورٹس ڈے منایا جاتا۔ لڑکیوں کا چاٹی ریس میں حصہ لینا ایک بڑا پُر لطف Event تھا۔ اوول سے دوسری جانب سائیکالوجی ڈیپارٹمنٹ تھا۔ پھر یہ سڑک ذرا سی چڑھائی چڑھ کر پرنسپل آفس تک پہنچتی۔

پرنسپل صاحب کی کار پورچ میں کھڑی نظر آتی تو طالب علم خاموشی سے گزرتے ورنہ ہنسنا بولنا فقرے کسنا بتلا دیتا تو اس عمر کا خاصا ہے۔ پرنسپل کے دفتر کے ساتھ ہی بائیں طرف ایک چھوٹا سا لان تھا اور اس کے عین سامنے بھی کھلی جگہ تھی جس پر بعد میں اوپن ایئر تھیٹر تعمیر کیا گیا۔ اس لان سے ملحق سوئمنگ پول تھا جس میں سپورٹس کے دنوں میں بڑی جوش و خروش کی ریسیں ہوتیں۔

ففتھ ایئر کے آخر میں جب سوئمنگ Events ہوتے تو اس میں ایک ریس اپنی نوعیت کی اختراع تھی۔ ایک لڑکی سوئی دھاگہ پکڑ کر ٹینک کے آخری سرے پر بیٹھتی اور فری سٹائل میں تیرنے والا اُس تک پہنچتا۔ لڑکی سوئی میں دھاگہ پرو کر Contestant کو پکڑاتی۔ وہ اسے واپس لے جا کر ریفری کو پکڑاتا۔ اگر سوئی سے دھاگہ نکل جاتا تو اُس کے نمبر کٹ جاتے۔

اُن دنوں جب ہمارا ففتھ ایئر ختم ہوا تو ریزی بھائی کا دوست بھی کالج میں پڑھتا تھا۔ ان کے ساتھ ہمارے جالندھر سے مراسم چلے آتے تھے۔ میں نے اس کے ساتھ مل کر اس ریس میں شرکت کی اور ریاض فسٹ آیا۔

لیڈی میکلیگن سے دو راستے گورنمنٹ کالج کو جاتے تھے۔ ایک راستہ تو میں اوپر بیان کر چکی ہوں۔ دوسرا راستہ پرنسپل لاج کے سامنے سے گزر کر باہر نکلتا تھا۔ سامنے بہت بڑی گراؤنڈ تھی' جس میں ہر سال انٹر کالجیٹ مقابلے ہوتے تھے اور بڑی بڑی ٹرافیاں لڑکیوں کو ملتی تھیں۔

حسنِ اتفاق سے دو مرتبہ ان کھیلوں کی اناؤنسمنٹ کرنے کا مجھے موقع ملا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ میں اناؤنسمنٹ کرنے سے پہلے عموماً اشعار پڑھ کر ناظرین کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ مجھے یہ تو معلوم نہ تھا کہ Master of Ceremony کو کیا کرنا چاہیے چونکہ ایم اے کی وجہ سے اشعار سے واقفیت تھی اس لیے میں نے از خود یہ طریقہ رائج کر لیا تھا۔

اس گراؤنڈ میں ملحق خواتین کے لیے سوئمنگ ٹینک تھا اور اس کے بعد سڑک پار کر کے ایم اے او کالج کی بلڈنگ آ تی تھی۔ میں نے اس ٹینک کا بھی فائدہ اُٹھایا اور سوئمنگ سیکھی اور بالآخر مقابلے میں حصہ لے کر فسٹ آئی اور کلر ہولڈر رہی۔

میں نے آپ کے لیے بساط بھر اپنی رہائش گاہ کی تفاصیل بیان کر دی ہیں۔ میری والدہ مجھے اس محاصرے سے نکال کر سڑکوں کے حوالے نہیں کرنا چاہتی تھی' لیکن فیصلہ ہو جانے کے بعد انہوں نے ایک لفظ منہ سے نہ نکالا۔ جب ہم دھرمسالہ میں تھے تو دسویں کرنے کے بعد مجھے تعلیم حاصل کرنے کے لیے یا تو بوائز کالج بھیجنا پڑتا یا پھر لاہور میں داخل لینے کی ضرورت پیش آتی' لیکن میری والدہ مخلوط تعلیم کے حق میں نہ تھیں۔ انہوں نے چند معتبر لوگوں سے مل کر ایک چھوٹا سا پرائیویٹ کالج لوئر بازار میں کھول دیا۔ یہاں پر وہ تمام لڑکیاں داخل ہو گئیں جو لاہور جانے سے معذور تھیں۔

یہاں ہی موسیٰ کو چپڑاسی کی نوکری دی گئی۔ تجتی النسل' خاموش طبع' فربہی مائل درمیانے قد کا موسیٰ عموماً بے رنگ سے کپڑے پہنتا تھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ موسیٰ نے امی کو تلاش کر لیا اور لیڈی میکلیگن آ پہنچا۔ اسے فوراً چپڑاسی کی نوکری مل گئی اور اسی کو مجھے کالج لانے لے جانے کی ڈیوٹی دے دی گئی۔

موسیٰ نے کبھی میرا نام نہ لیا۔ ہمیشہ بی بی جی کہہ کر بستہ پکڑ لیتا۔ ہولے ہولے ایک دو قدم پیچھے چلتا لیکن جب ہم پرنسپل کرامت کے دفتر کے قریب پہنچتے تو یکدم موسیٰ میرے آگے آگے چلنے لگتا۔ گورنمنٹ کالج کے برآمدے بڑے بڑے خوبصورت اور گوتھک آرٹ کا نمونہ تھے۔ ایسا ہی ایک لمبا سا برآمدہ اردو کلاس کے سامنے بھی تھا۔ یہاں پہنچ کر عموماً موسیٰ کمرے کا دروازہ کھول کر ایک طرف ہٹ جاتا اور جب میں اندر داخل ہو جاتی تو دروازہ بند کر کے غائب ہو جاتا۔ اس کے بعد اوول کے گرد بنی ہوئی سڑک پر ہمیشہ ایک ہی بنچ پر بیٹھتا جو پرنسپل کے دفتر سے ذرا سی دور تھی۔

جس روز پہلے دن میں ایم اے اردو کی کلاس میں داخل ہوئی۔ میں تھوڑی سی نروس تھی۔ ہر نئی چیز عموماً ہیبت کا باعث بن جاتی ہے۔ کلاس کے کمرے میں ایک لمبی مستطیل میز بچھی تھی۔ اس کی لمبائی کے دونوں رُخ پر کرسیاں تھیں۔ میز سے قریباً چار سیڑھیاں اُونچا ایک ڈائس تھا جس پر ایک روسٹرم اور دیوار کے ساتھ لمبا سا بلیک بورڈ ٹنگا تھا۔ اس بلیک بورڈ پر عموماً عربی' فارسی اور انگریزی لکھی نظر آتی۔ بہت کم اردو کے الفاظ لکھے جاتے۔

پہلے دن کمرے میں کوئی پروفیسر موجود نہ تھا۔ لمبی میز پر سامنے کی طرف مولوی طوطا' قمر صاحب بیٹھے تھے

ان کی پشت دروازے کی طرف تھی اور اس وقت یہاں آپا زبیدہ اور ذکیہ بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھ کر آپا نے مجھے اپنے ساتھ والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

ابھی کاپیاں کتابیں رکھ کر سیٹل ہو ہی رہی تھی کہ ایک خوبصورت گورا چٹا اطالوی شکل وصورت کا نوجوان اندر داخل ہوا۔ اس نے لٹھے کی شلوار نیلی لکیروں والا سفید کرتا اور پشاوری چپل پہن رکھی تھی۔ وہ بڑی ملائمت کے ساتھ آگے بڑھا اور مردانہ قطار میں مولوی طوطا کے ساتھ بیٹھ گیا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر نوجوان نے اپنا تعارف کرانے کے انداز میں کہا...."خواتین وحضرات! میرا نام اشفاق احمد ہے۔ میں مشرقی پنجاب کے ضلع فیروزپور سے آیا ہوں۔ ہمارے قصباتی شہر کا نام مکتسر ہے۔ میرے والد وہاں ڈاکٹر تھے۔ پھر رفتہ رفتہ حیوان ناطق کا علاج بھی کرنے لگے.... ہم آٹھ بہن بھائی ہیں اور اس وقت میں موج دریا کے پاس 1- مزنگ روڈ میں رہتا ہوں۔ میرے پاس ایک سائیکل ہے جس پر میں اس وقت آیا ہوں...."

یہ کہہ کر اشفاق احمد نے کلاس کے لڑکے لڑکیوں پر نظر دوڑائی۔ سب خاموش تھے۔ ابھی Orientation کی رسم کا رواج نہ تھا۔ لوگ اپنا تعارف حدود اربعہ ہسٹری بتاتے ہوئے شرماتے تھے۔ صرف اشفاق احمد نے سب کی سہولت کو مدنظر رکھ کر اپنا آپ تھالی میں رکھ کر پیش کر دیا۔

آپا زبیدہ اور مولوی طوطا نے نہ لیا اسے شوخی سمجھا۔ ذکیہ جو بلند شہر سے آئی تھی اشفاق احمد جیسے صاحب حسن و جمال سے متاثر ہوگئی۔ مجھے تو ویسے ہی متاثر ہوتے دیر نہیں لگتی۔ لیکن میرے اندر بھی تھوڑا سا ردعمل پیدا ہوا۔ میں نے دل میں سوچا کہ مقابلہ سخت ہی لیکن میں محنت کروں گی اور بالآخر ضرور جیت جاؤں گی۔

سب سے پہلے غلام محی الدین کمرے میں آئے۔ انہوں نے اپنا تعارف آتے ہی انگریزی میں کرایا۔ بلیک بورڈ صاف کر کے کیپٹل لیٹرز میں اپنا نام لکھا۔ پھر روسٹرم پر آئے اور اپنا تعارف جاری رکھا۔ کچھ دیر انگریزی میں بولنے کے بعد وہ اردو میں جاری ہو گئے۔

ان کا لب ولہجہ اس بات کا غماز نہ تھا کہ ان کی اردو اکتسابی ہے۔ وہ زیادہ وقت انگریزی بولتے لیکن جب اردو میں بولتے تو ایسی ٹکسالی اردو اور اس قدر روانی کے ساتھ جاری ہوتی کہ فلسفہ خودی "اسرار ورموز"، "ارمغان حجاز" سب آسان بن جاتی۔ سمجھنے میں کچھ دشواری نہ ہوتی۔

دبلے پتلے بڑی نیلی آنکھوں والے اثر صاحب انگریزی میں بولے...."میں مدراس سے آیا ہوں اور اس وقت کنٹرولر آف Examinations ہوں۔ میرا کمرہ لیڈیز روم کے بالکل سامنے ہے جہاں برآمدہ مڑتا ہے عین وہیں..... آپ میں سے کسی کو کسی قسم کا مسئلہ درپیش ہو تو وہ میرے پاس آئے..... میں دیکھوں گا کہ آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔"

مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ اس پہلی ملاقات میں ہی کس بنا پر اثر صاحب اور خاں صاحب نے ایک دوسرے کو لمبے عرصے کے لیے چن لیا۔ بہت جلد خاں صاحب اثر صاحب کے گھر آنے جانے لگے لیکن کالج میں کبھی کسی کو شک تک نہ ہوا کہ اشفاق صاحب اور اثر صاحب میں کالج کے بعد ایک بے تکلفی کا رشتہ بھی ہے۔ اس دوستی کی گہرائی اور گیرائی کو بس

یہی دونوں جانتے ہیں۔

اثر صاحب مدراس میں ڈپٹی کمشنر تھے لیکن مہاجر بن کر یہاں آ گئے اور ڈپٹی کمشنری کا رعب کبھی نہ جھاڑا۔ صرف میں انہیں ڈپٹی صاحب بلاتی تھی اور بلاتی رہی۔ وہ بیڈن روڈ کے عقب میں لکشمی مینشن کی ایک نچلی منزل میں اپنی اہلیہ آپا ممتاز کے ساتھ رہتے تھے۔

کالج کے اوقات کے بعد وہ ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کے لیے کالم لکھتے۔ رفتہ رفتہ وہ اُسی اخبار کے ایڈیٹر ہوگئے۔ خاں صاحب بھی وہاں پہنچ جاتے۔ اثر صاحب آئی سی ایس تھے لیکن اُن میں وہ شیخی خوبو نہ تھی جو عموماً اس کلاس میں ہوتی ہے۔

اثر صاحب کو اقبال اور پاکستان کی محبت کھینچ لائی تھی۔ پاکستان آ کر ڈپٹی صاحب نے بڑی طوفانی زندگی گزاری۔ اُن کے بچے جاوید، کمال، سعیدہ، تہمینہ اور سلمیٰ اپنے اپنے مقام پر جمے تھے لیکن اثر صاحب میں عورتوں کے لیے بڑی کشش تھی۔ ایک امیر کبیر بیگم اُن پر لٹو ہوگئیں اور دوسری شادی پر آمادہ کر لیا۔ ممتاز آپا کا کمال ہے کہ انہوں نے کبھی اُف تک نہ کی اور بیگم صاحبہ جب گھر کے اوپر والے پورشن میں منتقل ہوگئیں تو بھی وہ خاموش رہیں۔

سعیدہ ٹیلیویژن کی بڑی آرٹسٹ بنی۔ تہمینہ کے نصیب میں ممتاز مفتی کی بہو اور عکسی مفتی کی بیوی بننا لکھا تھا۔ سلمیٰ ابھی بھی ٹیلیویژن سے منسلک ہے اور جاوید اثر نے امریکہ جا کر ایک امریکن خاتون سے شادی کر لی اور کمال پی آئی اے میں بڑا افسر بن گیا۔

اثر صاحب ایک آرٹسٹ تھے۔ اُن کی زندگی طوفانی تھی اور آخر تک رہی..... آرٹسٹ لوگ لہروں کی طرح ساحلوں پر پٹخنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ہم ان کی حالت کو سمجھ نہیں سکتے۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ وہ ایک باپ کی طرح میری حفاظت کرتے تھے اور کرتے رہے۔

خاں صاحب ایم اے اردو میں منشی فاضل کر کے پہنچے تھے۔ اُن کے افسانوں کا مجموعہ ''ایک محبت سو افسانے'' چھپ چکا تھا۔ وہ کالج کے بعد عام طور پر مکتبہ جدید چلے جاتے' لیکن ہم سب ہم جماعت کم تجسس اُس سے کم انفرمیشن اور بے حد کم علم طالب علموں کا گروہ تھا۔

آپا زبیدہ ڈپٹی کمشنر کی بیگم ضرور تھی لیکن علم سے اُن کا کوئی ناطہ نہ تھا۔ ذکیہ لب ولہجہ کو اردو زبان پر عبوری کا سرٹیفکیٹ سمجھتی تھی۔ مولوی طوطا شاید اپنی عربی کے بل بوتے پر اپنے آپ کو اردو دان سمجھتے تھے۔ رہ گئے قمر الزماں یہ بڑے سادہ لوح انسان تھے۔ نہ انہیں کسی بات پر مان تھا نہ کسی بات کی شیخی ہی تھی۔ وہ بچوں کے سے تحیر کے ساتھ پروفیسروں کو دیکھا کرتے۔

یہ عجیب سی بات ہے کہ جو کوئی بھی اُن دنوں کونونٹ یا کسی مشنری سکول کی شکل دیکھ لیتا تھا' اس میں مغربی کلچر' انگریزی زبان اور رہن سہن کی شدھ بدھ پیدا ہو جاتی تھی۔ وہ مقامی کلچر' علم' زبان والے کو کمتر سمجھنے لگتا تھا۔ یہ احساس غالباً فاتح کے ساتھ مل جانے سے پیدا ہوتا ہے۔

اب انگریز تو رُخصت ہو چکا تھا اور وجہ بھی وہ نہیں رہی کہ فاتح کا کلچر اپنا کر انسان اپنے آپ کو برتری کی خلعت

ے لیکن سفید فام قوموں کا تہور پہلے سے بڑھ گیا ہے۔ امریکہ بہادر کے ہاتھ میں مشرقی قوموں کو سجدہ ریز رکھنے کا ہے۔ جاپانی، چینی تو اس رعب تلے اس قدر دبے ہوئے نظر نہیں آتے لیکن مسلمان قومیں آنکھیں بھی دکھا رہی ہیں اور حسب توفیق خوب کھا رہی ہیں۔ اگر وہ اٹھتے ہیں تو بنیاد پرست کہلاتے ہیں۔ دہشت گرد بن جاتے ہیں اور اگر لتے ہیں، تو لبرل تو بن جاتے ہیں لیکن بی کلاس سٹیزن کی طرح اُن کی اپنی شناخت ختم ہو جاتی ہے۔

کالج میں مجھے ان باتوں کا قطعی احساس نہ تھا۔ میرے پاس ''فسانۂ آزاد'' کی ساری جلدیں تھیں اور میرا مبلغ تک محدود تھا۔ میری عقل ملاحظہ فرمایئے کہ اتنی تعلیمی استعداد پر مجھ میں خود اعتمادی سب سے زیادہ تھی۔ جس اشفاق ''گلستان''، ''بوستان''، حفظ تھی، جو فارسی عربی کا سکالر ہونے کے باوصف اردو کی ان گنت کتابیں کھنگال چکا تھا۔ جس ے اندر ہی اندر Underrate کر رہی تھی۔

اب مجھے پتہ چلتا ہے کہ اُن کا ایک مسئلہ تھا۔ وہ اپنے کسی ہم جماعت کو احساس کمتری میں مبتلا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ احساس کمتری میں مبتلا انسان ناکارہ ہو جاتا ہے۔ وہ دہشت گردوں سے جا ملے یا خودکش بم کے ے اپنا آپ ختم کر ڈالے۔ ذہنی مریض بن کر کسی ہسپتال میں جا پہنچے یا کسی قتل کا مرتکب ہو جائے۔ بہرکیف زندگی کے لیے معنی کھو دیتی ہے۔

وہ ہم سب کی تھوڑی تھوڑی مدد یا رہنمائی کرتے رہتے تھے، لیکن ہمیں کسی شکر گزاری میں مبتلا نہیں کرتے تھے۔ میں ''ہمدردی'' لفظ کو ''ھمد ودری'' لکھا کرتی تھی۔ اشفاق صاحب اپنی کاپی پر ہمدردی لکھ کر یوں آپا زبیدہ کو دکھاتے گویا ح چاہتے ہیں۔ میری نظر پڑ جاتی تو میں اپنی اصلاح کر لیتی، لیکن مجھ میں اتنی عقل نہ تھی کہ اعتراف شکست کرتی۔

ابھی Self-projection کی بیماری عام نہ ہوئی تھی اور خودستائشی انداز زیست کو بُرا سمجھا جاتا تھا۔ خاں ب تو اس معاملے میں بہت ہی شرمیلے اور گونگے تھے۔ وہ اپنا سارا وقت اپنے جملہ نالائق ہم مکتبوں سے اپنا آپ کمتر بت کرنے میں صرف کیا کرتے۔ زیادہ جانتے اور کم ظاہر کرتے۔ اُن کی کتاب ''ایک محبت سو افسانے'' چھپ چکی تھی، ن اُن کے منہ سے اس کتاب کا ذکر بھی نہ سنا۔

اُن کی ذاتی لائبریری تھی جس میں ان گنت کتابیں تھیں۔ اُن کی ملاقات ادیبوں سے تھی۔ کافی ہاؤس میں جگی سے جایا کرتے تھے۔ کالج سے مکتبہ جدید جانا اُن کے معمولات میں سے تھا۔ اثر صاحب سے ملاقاتیں عام تھیں، ن ان ساری Activities کا خاں صاحب نے کسی کلاس میں کبھی ذکر نہ کیا۔ کلاس میں انہوں نے کبھی ذہانت کا سکہ نے کے لیے مشکل سوالات نہ پوچھے۔

ایک بات البتہ اُن کی علم دوستی کی غماز تھی اور وہ لائبریری کی کتابیں تھیں۔ ان کو بھی کوئی شومارے بغیر وہ کسی بچے طرح اُٹھائے پھرتے۔ میں نے یونیورسٹی لائبریری کا نیا نیا کارڈ بنوایا تھا۔ یہ لائبریری انارکلی جانے والے راستے پر تھی عام طالب علم کو خوفزدہ کرنے کے لیے کافی تھی۔

ایک روز جب میں لائبریری سے باہر نکلی تو برآمدے میں مجھے اشفاق احمد ملے۔ انہوں نے نہ مجھے سلام کیا نہ نس لیا۔ بس آہستہ سے بولے..... ''کیا میں آپ کی کتابیں دیکھ سکتا ہوں؟''

میں نے کتابیں پیش کر دیں۔ انہوں نے چند لمحے اوراق اُلٹ پلٹ کر دیکھے اور پھر بولے ''دیکھئے اگر آپ چاہیں تو ہم کتابیں Exchange کر لیتے ہیں۔ میں چند دن کے بعد آپ کو یہ ساری لوٹا دوں گا۔''

جب میں کتابیں لے کر گھر آئی تو مجھے احساس ہوا کہ میں نے کورس کے متعلق درست چوائس نہیں کی تھی اور میں درست نہج پر کتابیں نہیں پڑھ رہی تھی۔ اشفاق صاحب نے مجھ سے جو کتابیں تبادلے کے طور پر لی تھیں ایم اے کے مطالعے کی غرض سے بے کار تھیں، لیکن انہوں نے میری عزت نفس کا پاس رکھا۔ یوں میری انا مجروح کیے بغیر، مجھ پر اپنی علمیت کا رُعب ڈالے بغیر خاں صاحب نے مجھے تاریخ ادب اردو، موازنہ انیس و دبیر، مولوی عبدالحلیم شرر کے ناول، محمد حسن عسکری کے افکار پیش کر دیئے۔

عورتیں کن بلندیوں کو چھو سکتی ہیں اس کی طرف توجہ دلانے کے لیے انہوں نے عصمت چغتائی کی ''ٹیڑھی لکیر'' اور قرۃ العین حیدر کے افسانے بھی ساتھ نتھی کر دیئے۔ میں نے اس کے بعد پنجاب لائبریری جانا چھوڑ دیا۔ مجھ تک کتابوں کی ترسیل مسلسل ہوگئی تھی۔ وہ اگر اپنی ذاتی لائبریری سے کتابیں مستعار دیتے تو ہمیشہ ظاہر کرتے گویا یہ بھی پنجاب پبلک لائبریری کی کتابیں ہیں۔

ان کتابوں کی آمد و رفت سے اچانک میں خوفزدہ ہوگئی۔

ایک روز میں گھر جانے کے لیے برآمدے میں نکلی ہی تھی کہ اشفاق احمد کہیں سے آ گئے۔ اُن کے ہاتھوں میں حسب معمول کتابیں تھیں۔ چہرے پر جنتی بجھتی مسکراہٹ تھی۔

''آپ نے یہ خطوط پڑھے ہیں؟''

مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ کن خطوط کی بات کر رہے تھے؟

''جی نہیں.....''

''یہ کورس کی کتاب نہیں ہے۔ ملینا (Malina) کے نام خطوط ہیں لیکن بڑے خوبصورت.....''

وہ آؤٹ آف کورس بات کر رہے تھے چونکہ مجھے اُن کی کتابوں سے فائدہ پہنچ رہا تھا۔ میں نے ملینا کے خطوط بھی پکڑ لیے۔

یہ خط جذبات میں بھیگے ہوئے بلکہ آنسوؤں میں سنے ہوئے تھے۔ لکھنے والے نے بڑی عاجزی سے ملینا کے حضور عرض کی تھی کہ ''جس کرسی پر تم بیٹھ کر جاتی ہو وہ تمہارے جانے کے بعد بھی تمہارے وجود سے بھری رہتی ہے۔ جس کمرے میں سے تمہارا وجود گزر جاتا ہے وہاں تمہاری خوشبو سانس لینا دشوار کر دیتی ہے۔ ہر موسم میں ہر جگہ تمہاری چھاپ لگی ہے۔ بتاؤ میں اس دیوانگی سے کیسے نجات پاؤں؟''

ان خطوں کو پڑھنے کے بعد میں چور سی بن گئی.....اب مجھے کتابیں پکڑتے ہوئے خوف سا آتا تھا۔ وہ نہ ہو کسی دن کسی کتاب میں سے کوئی محبت نامہ نکل آئے اور پھر وہ خط مجھے اپنی والدہ کو دکھانا پڑے۔ اب میں نے اس کا یہ راستہ نکالا کہ کبھی کتابیں لے لیتی کبھی انکار کر دیتی۔ رفتہ رفتہ جب کتابوں کی ترسیل میں تواتر نہ رہا تو اشفاق صاحب نے ایک اور راستہ نکالا۔

مجھے برآمدے میں روک کر انہوں نے سوال کیا ''آپ کے پاس دونی ہوگی؟''

جی.....ہے۔"

"دے دیجئے میری سائیکل پنکچر ہوگئی ہے۔"

میں نے دونی نکال کر دے دی۔

بغیر شکریہ ادا کیے وہ چپکے سے چلے گئے۔

انھوں نے ہتھیلی بڑھائی۔ دونی یوں وصول کی گویا کسی دربار میں خلعت سے نوازے گئے ہوں۔ پھر شانِ استغنا سے بغیر شکریہ ادا کیے لوٹ گئے۔ سفید ہتھیلی کے آگے پست سوال صورت بڑھنا اور بگڑے دل شہزادے کی طرح لوٹ جانا..... دونی کا مثل جزیہ کے پیش کرنا اور بڑھ تھڑے کیک کی طرح قبول کیے جانا..... ایک کندھا جھکا کر پشاوری جیبوں پر بوجھ ڈالتے ہوئے براؤن رنگ کی آنکھوں والے کا تیکھی نظر سے دیکھنا اور پھر روہانسا ہو کر لوٹ جانا.....

یہ سب میری یاد کی چلمن پر بنی ہوئی تصویریں ہیں۔ جب میرا جی چاہتا میں چلمن گرا کر اس کی سکرین پر بنی پرانی تصویریں دیکھ لیتی۔ جب جی نہ چاہتا اس چق نما چلمن کو لپیٹ کر اوپر کر دیتی۔

آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ انسان کی زندگی میں یادیں ایک عجیب و غریب رول ادا کرتی ہیں۔ ہر انسانی [illegible] کی طرح یاد کا طبائع پر مختلف اثر پڑتا ہے..... اس کے خصائص بھی انسانی اعمال کے جملہ خصائص کی طرح اچھے بھی مرتب ہوتے ہیں اور ان میں برائی کا نمک بھی شامل رہتا ہے۔

بابے لوگ کہا کرتے ہیں جو لوگ ماضی کی یاد اور مستقبل کے اندیشے میں مبتلا رہتے ہیں، وہ اپنے حال کو برباد کرتے ہیں۔ وہ حال کی گھڑی پر جو کچھ میسر ہے اس کا نہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں نہ حالیہ نقصان سے بچنے کی اُمید رکھ سکتے ہیں۔

لیکن اس امر کو بھی کیا کیا جائے کہ ماضی اپنی گہری چھاپ یاد کی صورت چھوڑ ہی جاتا ہے اور اس کی گرفت سے رہائی ممکن نہیں۔ جیسے ساحلِ سمندر پر گیلے پیروں کے نشان ریت پر دور تک نکل جائیں۔

یاد کا اپنی اپنی طبیعت، کردار، جملہ جرثومہ، ہسٹری سے گہرا تعلق ہے جو لوگ معمولی درمیانی سطح کی زندگی گزارتے ہیں جن کی وابستگی روح سے کم اور جسم سے زیادہ ہوتی ہے، جن کے Genes خوش رہنے کا فن جانتے ہیں اور جنہیں سرشت میں کام، کرودھ، ہنکار نہیں ملا ہوتا، انہیں یادوں کا Lasso چکر کر زرخرید نہیں بنا سکتا۔

یہ لوگ کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، نسل آگے بڑھانے اور سیر سپاٹے میں مگن زندگی کو بیہودہ یادوں کے حوالے نہیں کرتے..... ایسے لوگ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ نہ یہ خود ارتقائے انسانی میں حصہ لیتے ہیں نہ ارتقائے حیات کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ ان کے لیے واقعات، حادثات، واجبات آئے اور چلے گئے۔ بیٹھ کر ان پر تاسف کرنا، حساب کتاب کرنا، جمع جتھا ملانا ان کی عادت نہیں۔ جب تک ان کی جسمانی ضرورتیں بمقدار وافر سہولت کے ساتھ پوری ہو رہی ہیں انہیں کسی سنگِ میل کنارے کھڑے ہو کر پرانے راستے کو دیکھتے رہنے کی حاجت پیش نہیں آتی۔

بنی نوعِ انسان زیادہ تر ایسے ہی انبوہ کثیر کی کثرت سے بنا ہے۔ یہ نہ ماضی کی یاد میں بے قرار ہوتا ہے نہ مستقبل کے اندیشے میں مبتلا ہوتا ہے۔ حال میں رہتا ہے لیکن عجیب بات ہے کہ اس کی حال میں مشغولیت بابوں جیسی نہیں ہوتی۔ یہ جب حال میں مشغول ہوتے ہیں تو غالباً وہ حال کی گھڑی کو رب سے منسوب کر کے راضی برضا ہونے کو زندگی کا

کندن بناتے ہیں۔

عام دنیادار آدمی کو نہ رب کی آگہی ہوتی ہے نہ راضی برضا ہونے کا فن آتا ہے۔ وہ گویا خالی الذہن ہو کر اپنی زندگی میں خوشی خوشی مگن، جسم کی ضرورت سے آگاہ چھوٹے بڑے کپڑے کو ناپتا چلا جاتا ہے۔ نہ اُسے مابعد کا خوف ہوتا ہے نہ نروان کا بھلیکا ستاتا ہے۔ نہ اُسے جنت اور دوزخ ہی کے وسوسوں کا کوئی اندیشہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ ہری ہری دھوپ کی طرح حدِ نظر تک سبزہ پھیلائے رکھتے ہیں اور آنکھ کا حالیہ منظر حسین رکھتے ہیں۔

ان لوگوں سے ہٹ کر کچھ لوگ فنونِ لطیفہ کے شیدائی، امر ہو جانے یا امر کر دینے کے شائقین، بے قرار، مضطرب..... ایسے لوگوں کے لیے یادیں تخلیق کا باعث بنتی ہیں..... ان کے لیے گزرے موسم ان کہی باتیں، ان چھوئے جسم، ادھورے واقعات، دھندلے چہرے، چھوٹی چھوٹی وارداتیں، غیر محسوس حد تک اُبھرنے والی خوشبوئیں، مسکراہٹیں، آنکھوں سے لوٹ جانے والے آنسو..... بستروں کی سلوٹیں، کھونٹیوں سے لٹکے ہوئے پرانے کپڑے، پرانا ٹوتھ برش، ٹوٹا ہوا پن، کاغذوں پر ادھوری سطریں، سوکھے پن ہمیشہ بامعنی رہتے ہیں۔

یوں سمجھئے جو کچھ گزر گیا ان کے اندر کسی پتھر کی سِل پر موہنجوداڑو کی عبارت بن کر مرتسم ہو گیا..... تخلیق کار اس عبارت کو پڑھنے میں برسوں صرف کرتا ہے۔ وہ ان ہی یادوں کے سہارے اُن لوگوں تک پہنچتا ہے، جو تخلیقی عمل میں تو داخل نہیں ہو پاتے لیکن یادوں کے ڈسے ہوئے رہتے ہیں۔

ان ہی یادوں کی کھنکھناتی مٹی سے آرٹسٹ کبھی شعر لکھتا ہے کبھی مجسمہ بناتا ہے۔ کبھی صفحۂ قرطاس پر شناسا سا چہرہ، بھولی بسری لگی، اداس دریچہ بنا لیتا ہے۔ گانے والے کی لے میں اُس کے سوز و گداز میں یہی یادیں اُبھرتی ہیں اور سننے والے اور اُس کے مابین ایک رشتہ استوار کر لیتی ہیں۔

یادوں کے ایندھن کے بغیر کبھی بااثر آرٹ جنم نہیں لیتا۔ اس گندھی مٹی کے نہ ہونے پر کوئی مہاتما بدھ کا مجسمہ نہیں بنتا۔ جسے صدیوں بعد لوگ حیرت سے دیکھیں۔ یادوں کے بغیر کبھی ایسی Levitation ممکن نہیں جس سے ارض زمین کا گھیرا دُور تک نظر آ سکے.....

کچھ عاشقوں کے لیے یاد زہر ہلاہل ہے۔ وہ مجنوں ہو یا سسی، ہیر ہو یا ماروی..... اُن کے لیے ایک چھوٹی سی یاد ساری زندگی پر محیط ہو جاتی ہے۔ وہ اس یاد کے گرداب سے نکل نہیں پاتے۔ یہی اٹل یادیں انہیں امر کر دیتی ہیں۔ پھر وہ عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی تک تو سفر کر سکتے ہیں، لیکن ان لمحوں سے نکل کر عام روایت، رسم و رواج، اقدار، مسلک کی پیروی نہیں کر سکتے۔ اُٹھتے بیٹھتے اُن کے لیے ان ہی یادوں کا تریاق اور ان ہی کا زہر ہلاہل ساتھ ساتھ دو نہروں کی طرح چلتا ہے، جن میں آڑ تو رہتی ہے لیکن وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔

یاد ایک عمومی، اساسی بنیادی کیفیت ہے جو ہر دل پر اپنا وار کرتی ہے۔ محبت کی طرح یہ بھی ہر در پر دستک دیتی ہے۔ پھر ہر انسان اپنی طبیعت، کردار، جینز کی انجینئرنگ، موروثی افتادِ طبع، تلاش کے مطابق اس یاد کو اپنے فائدے یا نقصان میں ڈھال لیتا ہے..... کچھ لوگ یادوں سے ایسے ڈسے جاتے ہیں جیسے کوڑیالے ناگ کا ڈسا پانی نہ مانگے..... کچھ دریچہ کھولتے ہیں۔ دُور کا منظر دیکھتے ہیں اور کھڑکی بند کر کے آرام سے سو جاتے ہیں۔

میرا خیال تھا کہ اس ''دونی'' کی وجہ سے کہیں بات نہ بڑھ جائے..... لیکن ہر بار وہ دونی مانگتے' لوٹانے کا وعدہ کرتے اور بغیر شکریہ ادا کیے آگے چلے جاتے..... بات کبھی آگے نہ بڑھی کیونکہ اشفاق احمد لڑکیوں کی طرح شرمیلے اور پٹھانوں کی طرح غیرت مند تھے۔

اشفاق احمد خاں اپنی خاندانی روایات کے تحت کسی غیر پٹھانی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے گھر والے فرداً فرداً اور مجموعی طور پر اتنے پسند تھے کہ وہ ان کی گرفت سے نکلنا گناہ کبیرہ سمجھتے تھے۔ ایسے میں وہ ایک قدم میری جانب بڑھتے تو دس قدم پسپائی کے اختیار کر لیتے۔ اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لیے انہوں نے ایک خوبصورت Defense mechanism اپنا لیا تھا۔

ایک روز صبح کے وقت جب وہ کالج آئے تو اُن کے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں شادی کا چھلا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح شادی شدہ ہونے کا اعلان تمام لڑکیوں کو اور خاص کر مشنری سکول کی پڑھی لکھی لڑکی کو دُور باش رہنے کی لال جھنڈی دکھا دے گا..... وہ کبھی کبھی نوٹس لینے سے پہلے چھلے کو انگلی میں گھما کر ہاتھ میز پر بھی اعلانیہ انداز میں رکھ دیتے لیکن مجھ پر اس اعلان نے خاطر خواہ اثر نہ کیا۔

میں ایسا فقیر تھی جو مانگنے تو نکلے لیکن اپنی عزت نفس بچانے کے لیے کاسہ چھپائے رکھے۔ قرض مانگنے کی اشد ضرورت ہو لیکن ساتھ ہی یہ آرزو بھی پال رکھے کہ یہ قرض کبھی واپس نہ مانگا جائے۔ بیٹی کا رشتہ خود ہاتھ جوڑ کر کرانے پر مجبور ہو لیکن مشہور یہ کر دے کہ لڑکے والوں نے پھیرے ڈال ڈال کر دہلیز توڑ دی ہے..... میں وہ لڑکی تھی جو عاشق کو اغوا پر مجبور کر دیتی ہے اور چاہتی ہے کہ گھر والے' معاشرہ' قانون سب عاشق کو موردِ الزام ٹھہرائیں..... ہنس ہنس کر یاری لگانے والی اور رو رو کر سارا کچا چٹھا بیان کرنے والی کا تضاد بڑا کربناک ہوتا ہے.....

ہم دونوں کے بنیادی تضادات نے ہماری شخصیت پر خوف کی مہر لگا دی تھی۔

اس خوف کا رنگ ہم دونوں میں یکساں نہ تھا۔ اشفاق خاں کا خوف شام کی دھندلی روشنی سے مشابہ تھا' جس میں نظر تو سب کچھ آتا ہے لیکن واضح کچھ نہیں ہوتا۔ میرے خوف کا رنگ بسنتی تھا۔ سارے میں سرسوں کھلی تھی۔ مجھے سارا سچ سرسوں کے کھیت کی طرح نظر آتا تھا۔ اسے ماننے کی ضرورت بھی نہ تھی لیکن اس سے مقابلہ کرنے سے میں بدکتی تھی۔

میں ہر روز کسی معجزے کا انتظار کرتی اور پھر خوف کی چادر اوڑھ کر سو جاتی۔ خاں صاحب شام ڈھلے پر بجھکے مارتی لالٹین کے لیے تیل خریدنے جاتے' لیکن دکان پر پہنچ کر وہ دونی دیتے ہوئے خوفزدہ ہو جاتے اور اپنے آپ کو غالب کی طرح سمجھاتے کہ اب میری آرزو ہے کہ زندہ نہ رہوں۔ خواہش اور گریز آری کی صورت اُن کے انداز چلتے۔ نہ وہ خواہش کے میدان میں نبرد آزمائی کرنے کے اہل تھے نہ مکمل طور پر بھاگ جانے کے اہل ہی..... پہلے انہوں نے چھوٹے چھوٹے سفر اختیار کیے اور پھر اسی گریز کی خواہش نے انہیں روم پہنچا دیا۔

اپنی اس کیفیت کو سمجھنے کے لیے وہ نوٹس لکھا کرتے تھے جواب ملے ہیں۔ اُن کی شادی کا چھلا تو آپ کو دکھایا نہیں جا سکتا کہ اب وہ عکسی مفتی کی ملکیت ہے اور وہ اسے اپنے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں شادی کا سمبل نہیں بلکہ اشفاق احمد سے وابستگی کے طور پر پہنتا ہے لیکن خوف کے متعلق اُن کی کاپی سے یہ خیالات برآمد ہوتے ہیں۔

فیصلے دو تھے اور دونوں پر عمل پیرا ہونا خطرناک بھی تھا اور ناممکن بھی لیکن جب انسان اپنی بساط بھر دو فیصلے کر کے ان دونوں پر پورا اترنے کی کوشش کرتا ہے تو عموماً اُسے دوہری ناکامی ملتی ہے۔ خاں صاحب نے بھی محبت کو شطرنج کی بازی سمجھ کر بار بار مہرے بدلے۔

جب اشفاق صاحب کی انگوٹھی نے خاطر خواہ نتائج برآمد نہ کیے۔ کتابوں کا رابطہ بھی ٹھنڈا پڑ گیا۔ دونی بار بار مانگنے کا کھیل بھی پھیکا پڑ گیا تو انہوں نے ایک اور سوانگ بھرا۔ وہ ایک دن کلاس میں آئے اور مولوی طوطا سے کہنے لگے..... ''کیا آپ نے اپنی اصلی عمر فارم میں بھری ہے؟''

''ہاں تو اور کیا.....''

''بڑی غلطی کی۔ آخر دو چار سال تو نوکری کی تلاش میں لگ جائیں گے۔ کیا پتہ ایم اے دو سالوں میں نہ ہو سکے تو پھر تو آپ سروس کے لیے Over age ہو جائیں گے۔''

سارے طالب علم چوکنے ہو کر سننے لگے۔

''میری عمر چھتیس سال ہے لیکن میں نے ساری باتوں کا پڑتالا کر سچ نہیں لکھا..... یہ حکمت ہے۔ جھوٹ نہیں ہے.....''

یہاں اُن کا مقصد ایک بار پھر لڑکیوں کو بڑھاپے کا خوف دلا کر بھگانا تھا۔ اب کبھی کبھی وہ کلاس میں کندھے پر مکیاں مارتے۔ اسپرو کی گولیاں پھانکتے..... چلتے میں لنگڑانے کی ایکٹنگ کرتے۔ مجھ سے آپا زبیدہ نے ایک روز کہا..... ''ہائے اشفاق! تو بڈھا ہے، لیکن لگتا نہیں ہے..... ہے نا.....''

میں چپ رہی۔ اُس زمانے میں واقعی چھتیس برس کا نوجوان بوڑھا لگتا تھا۔ مجھے سارے پروفیسراں ٹپی عمر کے ناکارہ بوڑھے لگتے تھے، لیکن خاں صاحب کے متعلق مجھے شبہ بھی نہ ہوا کہ وہ دوہرے فیصلے میں گھر کر یہ کھیل کھیلتے جا رہے ہیں۔ اُن کی عملی اور علمی مدد نے میری نالائقی کو اور مستحکم کر دیا تھا۔

اب بڑھاپا اُن کا نیا Defense mechanism بن گیا۔ اب بات بے بات بڑھاپے کا ذکر، بڑھاپے کا ڈھونگ، بڑھاپے کا رونا دھونا علانیہ اور اشارتاً ہونے لگا۔

اسی بڑھاپے کا ذکر انہوں نے اُن خطوں میں بھی کیا ہے جو انہوں نے اپنی بھانجی ناہید کو لکھے۔ اُسی کا فرکو دیکھ کر جینا جس پر دم نکلے اُن کا وظیرہ حیات بن گیا۔ وہ محبت کو انسان کی معراج بھی سمجھتے تھے اور اس محبت سے کنارہ کشی بھی چاہتے تھے۔

بڑھاپے نے ابھی اصل صورت بھی نہ دکھائی تھی لیکن پودا جو ''زاویہ'' تک پہنچتے پہنچتے پورا چھتنار درخت بن گیا تھا اس کا بیج بہت پہلے بویا گیا۔ ان دنوں وہ اپنی نوٹ بک میں بڑھاپے کے متعلق جو کچھ ارشاد کرتے رہے حاضر خدمت ہے:

بڑھاپا

آج ایسا دن پھر پتہ نہیں کب آئے گا۔ اس وقت مجھے اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ جی چاہتا ہے اونچے اونچے گاتا ہوا باہر سڑک پر نکل جاؤں اور ہر نوجوان کو روک کر اس کے بالوں کو غور سے دیکھ کر ٹھٹھے مار کر ہنسوں اور چلا چلا کر کہوں جاؤ اپنی

[illegible] سے کہانیاں سنو۔ اپنی اماں کو دھمکیاں دو۔ اپنے باپ سے پیسے مانگو!

صبح صبح شیو بناتے ہوئے آئینے میں ایک لمحے کے لیے میں نے صابن کے پھین سے نظریں ہٹا کر اپنے چہرے [illegible] اپنی چنیاں سی آنکھوں کا جائزہ لیا اور اچانک میری نگاہ بائیں کنپٹی پر جا پڑی۔ میں نے دیکھا وہاں ایک سفید بال [illegible] اور سیاہ بالوں کے درمیان سیمیں تار کی طرح چمٹا ہوا تھا۔ دوسرے بالوں کو ایک طرف ہٹا کر میں نے اچھی طرح [illegible] کا جائزہ لیا کہ کہیں مجھے دھوکا نہ ہوا ہو۔ لیکن واقعی وہ ایک سفید بال تھا۔ سفید بال۔ Gray hair۔ میری اُمیدوں [illegible] میرے ارمانوں کا روپہلی سپنا۔ میرا جی چاہا کہ میں اُسے ایک مرتبہ تو چوم ہی لوں۔ بائیں ہاتھ کی سیدھی انگلی سے [illegible] چھو کر میں نے اپنا پوتا چوم لیا.... صابن کے جھاگ کو اپنے چہرے پر اسی حالت میں چھوڑ کر میں جلدی جلدی نیچے [illegible] سیڑھیوں پر مجھے توقیر مل گیا۔ میں نے اُسے اپنی کنپٹی دکھا کر کہا ”دیکھنا یہاں ایک سفید بال بھی ہے؟“

تھوڑی سی تلاش کے بعد توقیر نے اُسے ڈھونڈ نکالا اور کہا ”ہاں ہے! کیا میں اسے اُکھاڑ دوں؟“

میں نے فوراً اپنے سر کو جھٹکا دے کر ہٹا لیا اور کہا ”نہ نہ! کہیں ایسا ظلم نہ کرنا۔ میری جان نکل جائے گی۔ میری [illegible] ہو جائے گی۔“

اپنے کمرے میں واپس آ کر میں نے جھاگ کو چہرے سے پونچھ ڈالا اور شیو نہیں بنائی۔ پھر میں کرسی کھینچ [illegible] کے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے کہا ”میری پیری کے پیامبر! تو دبے پاؤں میرے گھر آیا ہے ڈرتے ڈرتے جھجکتے [illegible] میں ایک مفلس اور نادار ادھیڑ عمر کا آدمی ہوں۔ بتاؤ میں تمہاری کیا خاطر کروں؟ لیکن اس قدر مسرور ہونے کے [illegible] ساتھ میں تم سے ناراض بھی ہوں۔ بتاؤ تو تم اتنی دیر سے کیوں آئے۔ تمہاری راہ تکتے تکتے میں نے حشر سے کئی دن [illegible] تمہارا انتظار کرتے کرتے میں نے کئی راتیں سیاہ کر ڈالیں اور تم اتنی دیر کے بعد آئے اور اگر تمہیں دیر ہی سے [illegible] اکیلے کیوں آئے؟

کیا تمہارے گروہ کو یقین نہ تھا کہ میرا سرِ تسلیم تمہارے لیے ہمیشہ خم رہتا ہے۔ کیا تمہارے قبیلے کو اعتبار نہیں آتا [illegible] سرِ نیاز اُن کے آستانے پر ازل سے جھکا ہوا ہے؟

بتاؤ نا تم اکیلے کیوں آئے؟

میں اپنے سفید بستر پر نسواری رنگ کی پلش کی رضائی لپیٹے بیٹھا تھا کہ میرا سب سے چھوٹا پوتا محمود میرے پاس [illegible] لگا ”بابا جان! اکنی دو میں لٹو لوں گا۔“ میں نے تکیے کے نیچے ہاتھ پھیر کر اُسے دوونی نکال کر دی۔ وہ دوونی لے کر [illegible] سے دوڑا۔ میں نے پکار کر کہا ”جانِ بابا آہستہ“ اُس نے میری طرف مڑ کر نہیں دیکھا' پر اس نے اپنی رفتار ہلکی کر دی۔ [illegible] طرح دوڑتے ہوئے دیکھ کر مجھے اس کے ابی کا بچپن یاد آ گیا۔ وہ بھی اسی طرح دوڑا کرتا تھا۔ اسی طرح ضد کیا [illegible] اور ایسے ہی روتا تھا۔

اور میرا سب سے بڑا پوتا کالج میں داخل ہو کر کچھ زیادہ ہی مصروف ہو گیا ہے۔ بلیزر پہنے ٹینس کا ریکٹ بغل [illegible] میرے پاس سے گزرا کرتا ہے اور مجھے بڑے ادب سے سلام کیا کرتا ہے۔ میں اس کے سلام کا جواب ہمیشہ [illegible] رہو“ کہہ کر دیا کرتا ہوں۔ مجھے بس یہی ایک دعا آتی ہے اور یہی اچھی لگتی ہے۔ کبھی کبھار وہ میرے پاس رُک کر

پوچھا کرتا ہے ''بابا جان! آپ کے زمانے میں بھی کالج میں ٹیلیویژن تھیٹر تھا؟'' تو میں مومنؔ کا دیوان بند کر کے اور اپنی عینک اُتار کر آہستہ سے کہا کرتا ہوں ''جب ہم تمہارے کالج میں پڑھتے تھے بیٹا تو سنا کرتے تھے کہ ٹیلیویژن ایجاد ہو چکا ہے اور امریکہ میں اس کے مظاہرے ہو رہے ہیں۔ اس وقت تھیٹر کہاں سے بنتا۔ یہ ہمارے بہت بعد کی بات ہے۔ اس وقت تو اس تھیٹر کی جگہ لائبریری ہوتی تھی اور اس کا لائبریرین اچھی عمر کا ایک سندھی تھا جو کب کا مر کھپ چکا ہوگا۔''

میرا چھوٹا پوتا آ کر کہتا ہے ''بابا میرا لٹو دیکھو! تمہیں گھمانا آتا ہے بابا؟''

میں چمکار کر کہتا ہوں ''اچھا ہے جانِ بابا۔ بڑا اچھا۔ اب مجھے گھمانا نہیں آتا۔ اب تم گھماؤ۔''

اور میرا پوتا اپنا ننھا ہاتھ کھول کر میری طرف اشارہ کر کے کہتا ہے ''لو اتنے بڑے ہو گئے اور لٹو گھمانا نہیں آتا۔''

میں ہنس دیتا ہوں اور میرا پوتا بھی ہنسنے لگتا ہے۔

میری پوتی آ کر کہتی ہے ''بابا سارا دن لیٹے کیا کرتے رہتے ہو۔ مجھے ''دیوانِ غالب'' ہی پڑھا دیا کرو۔''

اور میں کہتا ہوں ''دیوانِ غالب'' کسی سے پڑھا نہیں کرتے بیٹا! خود ہی سمجھا کرتے ہیں اور پھر تمہارے ''دیوانِ غالب'' کو میں کیا پڑھاؤں گا۔ ہمارے زمانے میں تو ''دیوانِ غالب''

نقشِ فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

سے شروع ہوا کرتا تھا اور تمہارے ''دیوانِ غالب'' کی سب سے پہلی غزل

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ میں ہوتا تو کیا ہوتا

کے شعر سے شروع ہوتی ہے۔''

اور میری پوتی روٹھ جاتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ پچھلے دیوان کی ترتیب غلط تھی اور مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔

بہت دنوں کی بات ہے جب وہ اپنا دیوان میرے بستر پر چھوڑ گئی تھی اور میں نے اسے اُٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا تو اُس کے ہر صفحے پر ایس (S) لکھا ہوا تھا اور ایک جگہ (Shahid) لکھ کر کاٹا ہوا تھا۔ میں نے اُسے بلا کر کہا ''اپنی کتابیں اس طرح خراب نہیں کیا کرتے بیٹا اور کتاب پر صرف اپنا ہی نام لکھا کرتے ہیں!''

یہ سن کر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ اپنی کتاب لے کر واپس چلی گئی۔

میرے ان جگر گوشوں کا ابّی شام کو دفتر سے آ کر ہر روز پوچھا کرتا ہے ''ابا جی! انگوڈین پی تھی؟'' اور میں مسکرا کر کہتا ہوں ''پی تھی بیٹا۔ پی لی تھی!'' اور وہ میری مسکراہٹ سے بھانپ جاتا ہے کہ میں نے دوا نہیں پی۔ چڑ کر کہتا ہے ''ابا جی! پتہ نہیں آپ کو کیا ہوا ہے۔ میری بکواس پر تو آپ توجہ ہی نہیں دیتے۔'' میں پھر ہنس پڑتا ہوں اور کہتا ہوں ''تیری بکواس سننے کے لیے ہی تو زندہ ہوں۔ بھلا مجھے اب اور یہاں کیا کرنا ہے؟''

اس دوران میں میرا بڑا پوتا پھر آ کر پوچھنے لگتا ہے ''بابا جان! آپ کے زمانے میں کالج کی مسجد اتنی ہی بڑی

تب ””تو میں پچھلے دن یاد کر کے کہتا ہوں ”مسجد کہاں تھی بیٹا! ایک چبوترہ سا تھا۔ اُس کے پاس یو۔او۔ٹی۔سی کے لڑکے چہل قدمی کیا کرتے تھے۔ اس کے پہلو میں انگریز پرنسپل کے نام پر ڈنکلف ملک بار تھی اور اس کے ساتھ پھل فروش کی ایک چھوٹی سی دکان۔ میں اس چبوترے پر نماز پڑھنے تو کبھی نہیں گیا تھا لیکن اپنے ہم درسوں سے سنا کرتا تھا کہ وہاں جمعہ کی نماز بھی ہوتی ہے۔“

پھر وہ پوچھنے لگتا ہے کہ اٹامک ریسرچ لیبارٹری میں.....

تو میرا بیٹا بات کاٹ کر کہتا ہے ”کیا فضول چیزیں پوچھتے رہتے ہو۔ تمہیں کالج کی تاریخ لکھنا ہے کیا؟“

میرا پوتا خاموش ہو جاتا ہے اور میں اپنے بیٹے کو جھڑک کر کہتا ہوں ”پوچھنے دو تمہیں کیوں تکلیف ہوتی ہے۔ مجھ ہی سے پوچھتا ہے نا!“

اپنے زمانے کی ساری مشعلیں ایک ایک کر کے بجھ گئیں۔

اثر مر گیا۔ قمر صاحب کا جنازہ نکل گیا۔ ممتاز کی ہڈیاں بھی گل چکیں..... کوتیدق نے آ لیا اور وہ دو بچے چھوڑ کر مر گئی..... اپنی عمر کو پہنچ کر ختم ہوگئی..... کا پتہ نہیں۔ مری نہ ہوگی تو مرنے والی ہوگی۔ ایک ایک کر کے سارے ساتھی چھوٹ گئے۔ بس زوبی اور میں رہ گئے۔ دیکھوں ہم میں سے پہلے کون چلتا ہے!

☆ گزرتے ہوئے سال ہم سب کو بوڑھا بنا دیتے ہیں لیکن دانشمند کسی کسی کو بناتے ہیں۔

☆ بڑھاپا بھی دراصل پتھر اور دھات کے زمانے کی طرح دھات کا زمانہ ہوتا ہے۔ دانتوں میں سونے کے تار لگے ہوتے ہیں۔ بالوں میں چاندی ہوتی ہے۔ آنکھوں میں قیمتی کا رنگ ہوتا ہے۔ (اور شلوار میں سکہ لٹک رہا ہوتا ہے)۔

☆ انسان کی تین عمریں ہوتی ہیں۔ جوانی' درمیانی عمر اور ”ماشاء اللہ ٹھیک ٹھاک نظر آ رہے ہو۔“

☆ بوڑھے آدمی اس لیے اچھے ہو جاتے ہیں کہ اُن سے بُرے بُرے ہوا نہیں جاتا۔

☆ وہی بچے ہمارے بڑھاپے کا سہارا ہوتے ہیں جنہوں نے ہمیں بوڑھا بنایا ہوتا ہے۔

☆ جوانی میں ہم مشکلات میں پھنسے رہتے ہیں بڑھاپے میں مشکلات ہمارے اندر پھنسی رہتی ہیں۔

☆ جب آپ تجربات سے بھر جاتے ہیں تو اس قدر بوڑھے ہو چکے ہوتے ہیں کہ کوئی بھی آپ کے تجربے کو ملازمت نہیں دیتا۔

☆ بھرپور بڑھاپا اس وقت آتا ہے جب آپ کی کالی ڈائری میں صرف ڈاکٹروں کے فون نمبر ہوتے ہیں۔

☆ بڑھاپے میں ہر روز دو دن کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

☆ بوڑھا ہونے میں یوں مزا نہیں کہ اُس کا مستقبل روشن نہیں ہوتا۔

☆ بڑھاپے کا اندازہ اس وقت لگتا ہے جب چلے بغیر آپ کے پاؤں دُکھنے لگیں اور بستر سے اُترے بغیر آپ کی ٹانگیں تھک چکی ہوں۔

☆ بڑھاپے کا ایک مزا یہ بھی ہے کہ جس قدر شور کا لیول اونچا ہوتا جاتا ہے' سماعت کا لیول نیچا ہوتا جاتا ہے۔

☆ جب آدمی جھولا کرسی میں بیٹھا ہو اور اُس کو ہلا نہ سکتا ہو اس وقت وہ بوڑھا ہو چکا ہوتا ہے۔

☆ مجھے اس وقت یقین آ گیا کہ میں واقعی بوڑھا ہو چکا ہوں جب ہوائی جہاز میں ایئر ہوسٹس نے پوچھا آپ چائے پئیں گے یا کافی یا ماءاللحم؟

☆ بوڑھے ماضی میں رہنا اس لیے پسند کرتے ہیں کہ ماضی بڑھاپے کے مقابلے میں کھلا، وسیع و عریض اور لمبا چوڑا ہوتا ہے۔

☆ جب آدمی بس میں اپنی سیٹ چھوڑ کر کسی خاتون کو دینی چاہے اور اس سے کھڑے نہ ہوا جائے تو سمجھے بوڑھا ہو چکا ہے۔

☆ سو سال زندہ رہنے کا ایک راز ہے..... سانس لیتے جاؤ!

☆ اکیلے بوڑھے ہونا بڑی دردناک بات ہے۔ میری بیوی ابھی تک وہیں کھڑی ہے جہاں کئی سال پہلے کھڑی تھی۔

☆ سڑک میں اپنے ہاتھ دھونے اور سیدھے چلنے پر جس قدر کوشش کرنی پڑتی ہے اس سے ایک بوڑھے کی اچھی خاصی ورزش ہو جاتی ہے۔

☆ بوڑھا ہونے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ آدمی جلدی نہ کرے۔ بس آہستہ آہستہ بڑھاپے میں داخل ہو۔

☆ آدمی اس وقت پورا بوڑھا ہو جاتا ہے جب اپنے سارے دانت ایک گلاس میں ڈالنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

☆ کئی بڈھے جوانی میں رہنا اس لیے پسند کرتے ہیں کہ وہاں سب کچھ سستا پڑتا ہے۔

☆ لمبے سفر پر جب ابھی نقدی ہو اور طاقت ختم ہو جائے تو سمجھو کہ بوڑھے ہو گئے۔

☆ بڑھاپے کا کچھ طے نہیں ہے۔ آدمی ایک صبح اٹھتا ہے۔ منہ پر ہاتھ پھیرتا ہے اور وہ بوڑھا ہو چکا ہوتا ہے۔

آدمی بوڑھا کب ہوتا ہے:

☆ جب ہوٹل میں جا کر اِدھر اُدھر جلوہ لینے کے بجائے مینو دیکھنے لگ جائے اور قیمتوں کا موازنہ کرے۔

☆ جب اس کو 8 کا ہندسہ 3 نظر آنے لگے۔

☆ سیر کے لیے جائے اور جا کر بنچ پر بیٹھ جائے اور سارا وقت بیٹھ کر یہ سمجھے اُس نے سیر کر لی۔

☆ جب اس کو سارے سوالوں کے جواب آتے ہوں اور کوئی بھی اس سے سوال پوچھنے والا نہ ہو!

☆ جب ہڈیاں سخت ہو جائیں۔ ناڑیاں سخت ہو جائیں..... نہیں جناب دل سخت ہو جائے!

☆ جب آدمی اُٹھنا چاہے اور اُٹھ نہ سکے۔ ہنس کے دکھا دے۔

☆ آدمی اُس وقت جوان ہوتا ہے جب صبح گیراج میں سے نکال کر سٹارٹ کرے تو سوئی صفر پر پہنچی ہوئی ہو اور بوڑھا اُن دنوں ہو جاتا ہے جب گیراج میں پہنچے ہمیشہ پٹرول کی ٹینکی فل پائے۔

☆ جب آرام کرنے میں زیادہ وقت لگے اور تھکنے میں کم تو سمجھو کہ بڑھاپا آ گیا۔

☆ بوڑھا ہونے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ہر وقت چھوٹوں کی نصیحتیں سننا پڑتی ہیں۔

- بڑھاپے سے گریز کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ آدمی چند نئے احمقانہ رویے سیکھ لے۔
- جب آدمی یہ سیکھ جاتا ہے کہ اُسے سوچ کر قدم اٹھانا چاہیے اُس وقت قدم اُٹھانا مشکل ہو جاتا ہے۔
- بڑھاپے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ کوئی تمہاری کہانی نہیں سنتا اور کوئی تمہاری نصیحت پر عمل نہیں کرتا۔
- بہت سے آدمی بس زندگی میں بوڑھے ہوتے چلے جاتے ہیں۔
- جیسے جیسے آدمی بوڑھا ہوتا جاتا ہے ویسے ہی اس کی دواؤں کی الماری بڑی ہوتی جاتی ہے۔
- بڑھاپے میں ہر انگ میں درد ہونے لگتا ہے اور جس میں نہیں ہوتا وہ کام کا نہیں رہتا۔
- بڑھاپے میں جب آپ اس بلندی پر پہنچ جاتے ہیں کہ کوئی چیز آپ کو تکلیف نہیں دیتی اس وقت کوئی بھی اپنا وقت ضائع نہیں کرتا، کوئی کچھ بھی نہیں کرتا۔
- زندگی میں بس ایک بڑھاپا ہی ایسی کمال کی چیز ہے جو بغیر کسی محنت اور کوشش کے خود بخود آ جاتا ہے۔
- دادا بننے سے آدمی بوڑھا نہیں ہوتا۔ دادی کا خاوند بننے سے بوڑھا ہو جاتا ہے۔
- آدمی اسوقت پورا بوڑھا ہو جاتا ہے جب ایئر ہوسٹس کی طرف دیکھنے کے بجائے کھانے کی ٹرے پر غور کرنا شروع کر دیتا ہے۔
- ہر شخص لمبی عمر کا خواہاں ہے لیکن بوڑھا ہونا کوئی نہیں چاہتا۔
- بڑھاپے سے دور رہنے کے لیے نئے خیالات اپناتے رہنا چاہیے اور پرانی عادتیں چھوڑتے جانا چاہیے۔
- آدمی زندگی گزارنے سے بوڑھا نہیں ہوتا۔ زندگی میں دلچسپی نہ لینے سے بوڑھا ہو جاتا ہے۔
- بوڑھا ہونے سے بھی ایک بُری بات یہ ہے کہ بڈھا بوڑھے ہونے سے انکار کر دے۔
- بوڑھے ہونے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ آدمی دیر سے بوڑھا ہوتا ہے۔
- اگر پرانے فرنیچر کی طرح پرانے بڈھوں کی بھی ایسی قدر افزائی ہوتی تو پھر بڑھاپے کا مزا تھا۔
- ایک شادی شدہ جوڑے کو بڑھاپے کے لیے صرف اپنے آپ کو سنبھال کر رکھنا چاہیے۔
- جو لوگ بڑھاپے میں مزے کی زندگی گزارتے ہیں انھوں نے جوانی میں ضرور چھوٹی چھوٹی خوشیاں خیرات کی ہوں گی۔
- آدمی سالوں کے گزرنے سے بوڑھا نہیں ہوتا۔ اپنے اصول چھوڑ دینے سے بوڑھا ہو جاتا ہے۔
- چالیس برس کی عمر جوانی کا بڑھاپا ہے اور پچاس برس کی عمر بڑھاپے کا بچپنا ہے۔
- میں بوڑھا آدمی ہوں اور میں نے بڑے بڑے خوفناک دن اور دردناک راتیں گزاری ہیں اور کئی کئی سال بڑے بھیانک اندیشوں میں گھرا رہا ہوں..... لیکن یہ سارے واقعات مجھ پر گزرے نہیں۔ بس مجھے دور سے ہی ڈراتے رہے اور میری زندگی اجیرن کرتے رہے۔
- بوڑھے ہونا ایک بُری عادت ہے جو انسان بڑی عمر میں پہنچ کر سیکھ جاتا ہے۔ اگر وہ مصروف رہے اور مسجد آتا جاتا رہے تو پھر یہ بُری عادت پڑ ہی نہیں سکتی۔

☆ اگر کوئی شے ''بوڑھی'' یا ''پرانی'' یا ''عمر رسیدہ'' ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ یہ چیز رہنے کے قابل تھی۔ اس لیے رہتی چلی آ رہی ہے اور رہتی چلی جائے گی۔

☆ جو شخص بیس برس کی عمر میں خوبصورت نہیں اور تیس برس کی عمر میں مضبوط اور طاقتور نہیں اور چالیس برس پر پہنچ کر امیر نہیں اور پچاس برس پر دانشمند نہیں تو پھر سمجھ لیجئے کہ وہ کبھی بھی خوبصورت' امیر' سمجھدار اور طاقتور نہیں رہا۔

☆ بڑھاپے میں جب ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے تو بڈھا کبھی بھی فون نہیں اُٹھاتا کہ میرے لیے تھوڑی ہوگا!

☆ دل کی عمر کا راز سفید بالوں سے لگایا جا سکتا ہے۔

☆ عورت اپنی عمر کے بارے میں اُس وقت جھوٹ بولنا شروع کرتی ہے جب اس کا چہرہ سچ بولنا شروع کر دے۔

☆ جب آدمی سیڑھیاں چڑھتے وقت اور سیڑھیاں اُترتے وقت ایک سا رہے جوان ہوتا ہے اور جب سیڑھیاں اُترتے وقت بھی اس کی سانس پھول جائے تو وہ بڈھا ہو چکا ہوتا ہے۔

بزرگ افراد کا یوم

اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے شروع تک تو بزرگوں کی عزت اور بزرگوں سے محبت مغرب میں بھی ایسے ہی تھی جیسے ہمارے یہاں مشرقی ممالک میں ہے۔ لیکن صنعتی انقلاب کے بعد یورپ اپنی دھن میں مصروف ہو گیا۔ بہت زیادہ مصروف۔

وہاں رشتوں میں رخنے پڑنے لگے اور خاندان اور گھریلو زندگی اور کنبے کی زندگی میں دراڑیں پڑنے لگیں۔

صنعتی ریل پیل اور دولت کی افراط نے جہاں سارے انسانی رشتوں پر شبخون مارے وہاں بوڑھے بزرگوں بوڑھے عزیزوں اور بوڑھے لوگوں پر مصروف معاشرے کی توجہ سب سے کم ہو گئی۔

مالی اور معاشی طور پر تو بوڑھے لوگ..... کسی قسم کے ''خطرے'' کا شکار نہ ہوئے لیکن جذباتی اور ''تعلقاتی'' طور پر انسانی گروہ سے بچھڑ گئے اور تقریباً آدھی صدی تک بے توجہی کا شکار رہے۔

اس کے بعد مغرب کے مفکروں اور دانشوروں اور سیاستدانوں نے اپنے بزرگوں کی طرف دوبارہ توجہ دی اور انہیں ''سینئر سٹیزن'' کا نام دے کر دوبارہ معاشرے میں..... اُن کا کھویا ہوا مقام دلانے کی جدوجہد شروع کر دی۔

وہ دن اور آج کا دن اب وہاں سینئر سٹیزن ڈے اور Senior Function اور..... سینئر سٹیزن Occasion بڑے شوق سے منایا جاتا ہے..... مشرق کے لوگ اور تیسری دنیا کے باسی بھی چونکہ ولایت کے مہذب دنیا کی پیروی کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اس لیے وہ بھی اس قسم کے تہوار منانے ضروری سمجھتے ہیں جو ترقی یافتہ دنیا میں منائے جاتے ہیں۔

باوجود اس کے کہ بوڑھے اور بزرگ اور عمر رسیدہ لوگ ہمارے معاشرے کا ایک اٹوٹ جزو ہیں اور ان کے بغیر ہمارا معاشرہ مکمل نہیں ہوتا۔ ہم بہ امر مجبوری اس قسم کے ڈے منانے پر مجبور ہیں.....

اب یہ تو ہوئی ناں میری جذباتی بات اور وابستگی کی بات..... لیکن اگر ہم اپنی پکی روایت کے باوصف اپنے

...ں کی حالت پرنگاہ ڈالیں تو بڑے معاشرے کی مختلف ٹکڑیوں میں ..... کہیں کہیں..... ان کی زندگی ویسی پُر وقار نہیں جیسے ہمارے باپ دادوں کے زمانے میں تھی۔ وہ بالکل بھلائے تو نہیں گئے البتہ ..... بے توجہی کا شکار ضرور ہیں۔

مجھ سے ابھی کوئی پوچھ رہا تھا کہ بزرگ کب ہوتا ہے۔ یعنی کوئی سینئر سٹیزن کب ہوتا ہے۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ ...مت میں جب وہ ریٹائر ہو کر گھر آ جائے۔

اور دوسرا کام کاج' تجارت' صنعت' دکانداری کرتے ہوئے وان پرست دور میں داخل ہو جائے۔ ایک تو بچپنا ...تا ہے۔ ایک گرہست دور ہوتا ہے اور اس کے بعد وان پرست دور ہوتا ہے۔ جب گھر کا بڑا دکان کی چابیاں بیٹے ...ہوئے کر گھر کا رہ جاتا ہے اور باقاعدگی سے محلے کی مسجد میں جانے لگتا ہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد یا وان پرست دور کے بعد یا سینئر سٹیزن بن جانے کے بعد محلے کی مسجد میں جا کر نماز شروع ...دینا ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ یہاں سینئر سٹیزن کو ایک روحانی اور معاشرتی کلب میں مفاہمت داخلہ مل جاتا ہے۔

"خوبی"

1. جب انسان میں کوئی چیز گنوانے کے قابل نہ ہو میرے آقا تو پھر اُسے سال ہی گنوانے پڑتے ہیں۔
2. جو شخص یہ سمجھنے لگ جاتا ہے کہ اس نے کمال حاصل کر لیا ہے اور نکتہ عروج پر پہنچ گیا ہے تو سمجھئے کہ وہ فوت ہونے کے قریب ہے۔
3. بڑے درخت پھل زیادہ نہیں دیتے' سایہ زیادہ دیتے ہیں۔
4. لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ تم نے کتنی جلدی کام کیا۔ یہ یاد رکھتے ہیں کہ کیسا کام کیا۔
5. دنیا میں سب سے بڑی لذت اُس کام کے کرنے میں ہے جس کو لوگ مشکل سمجھیں اور یہ کہیں کہ یہ کام نہیں ہو سکتا۔

"Old"

1. بالوں کے گرنے سے آدمی بوڑھا نہیں ہوتا میرے آقا! جب وہ اپنے اصول چھوڑتا ہے اور Ideal چھوڑتا ہے پھر بوڑھا ہو جاتا ہے۔ سال چہرے پر جھریاں ڈال دیتے ہیں اور ہمت اور امید کو چھوڑ دینے سے روح پر جھریاں پڑ جاتی ہیں۔ پریشانی' خوف' حزن و ملال' نا اُمیدی' مایوسی یہ انسانی سر کو جھکا دیتی ہیں اور روح خاک میں ملنے لگتی ہے۔
2. ایک پُر سکون بڑھاپا اس بات کی دلیل ہے کہ انسان نے جوانی اچھی گزاری اور شرافت سے گزاری۔
3. میرا تایا محکمہ زراعت میں بیلدار تھا اور اپنی ماہوار تنخواہ میں سے بھی ہر مہینے کافی کچھ بچا لیتا تھا۔ (اس کے بچے اُس کو Old کہتے ہیں)۔
4. بڑھاپے کا ایک یہ فائدہ بھی ہے جی کہ انسان ایک بار جھکنے میں دو چیزیں اٹھا لیتا ہے (ایک پڑی ہوئی ہو تو سوچتا